اقبال کا پیغام عصرِ حاضر کے انسان کے نام

از

جناب مولوی قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم۔ اے (علیگ)
(وائس پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج شاہجہاں پور)

عصرِ حاضر کا انسان ؎

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

بے شک زمانۂ حاضر کا انسان ایجاد و اختراع، فن و حکمت، سائنس و ہنر کے لحاظ سے کمال کے انتہائی مدارج پر گامزن ہے۔ اس کی نکتہ رس اور باریک بیں عقل نے ناممکنات کو ممکن بنا دیا جو چیزیں وہم و گمان و قیاس کے ماورا رکھتیں اب وہ روزمرہ کے حقائق میں شامل ہیں۔ سات سمندر پار والوں سے گفتگو کی جا رہی ہے، تصویریں بولتی ہیں۔ ٹیلی وژن سٹ گھروں میں نصب ہیں۔ ایکسریز ہمارے لئے ان دریچوں کا کام دیتی ہیں جن کے پٹ کھول کر ہم اپنے معدے اور آنتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری سڑکیں ربڑ اور شیشے سے بنائی جا رہی ہیں۔ ہماری کھیتی برقی قوت کے ذریعہ پکتی ہے، طے الارض کی کرامت کا ہم سے ظہور ہوتا ہے۔ فاصلے ہمارے لئے وجود نہیں رکھتے، ہمارے طیاروں نے زمین کو گھیر لیا ہے۔ بہرحال مشین کو ہم نے ایجاد کیا اور مشین نے ہماری زندگی میں عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا۔ اسی تغیر کی ماہیت اور اس کے دور رس نتائج پر ہمیں یہاں اقبال پر ہے۔ اور بتلانا ہے کہ زندگی پر مشین کے تسلط کی وجہ سے جو تہذیب پیدا ہوتی ہے اور فسادِ نظر میں مبتلا ہے اس کی روح میں عفت، اس کے ضمیر میں پاکی، اس کے خیال میں روحانی علو و بلندی اور اس کے ذوق میں لطافت و پاکیزگی مفقود ہے ؎

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اقبال کی نظر میں عہد حاضر کا انسان قلب و نظر کے امراضِ فاسدہ میں مبتلا ہے جس کا اصل سبب اقبال کے نزدیک حیاتِ انسانی کے وہ غلط نظریے ہیں جن کے تحت میں وہ آج اپنی زندگی گذار رہا ہے۔ اس لئے آیئے ذرا دیر کے لئے یکسو ہو کر ہم اجمالاً ان نظامہائے حیات پر نظر ڈالیں جس کو اس نے اپنا رکھا ہے۔

جزئیات و فروع سے قطع نظر اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسانی زندگی کے لئے جتنے مذہب و مسلک بنے ہیں وہ بالعموم چار ہیں

۱۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے۔ جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے، یوں ہی بن گیا ہے، یوں ہی چل رہا ہے اور یوں ہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا کی دیگر اشیاء کی طرح انسان بھی ایک ہے اس کی بھی کچھ خواہشات ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے علم و عقل کا سہارا کافی ہے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ انھیں نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دنیا پرستوں نے ہر زمانہ میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر حکمرانوں نے، امیروں نے، درباریوں نے اور اربابِ حکومت نے، خوشحال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے۔ اس کو ہم "ملحدانہ یا جاہلانہ" نظریۂ حیات کہہ سکتے ہیں۔ زمانۂ اسلام سے پیشتر جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے اگرچہ اہل مغرب سب کے سب خدا و آخرت کے منکر نہیں ہیں، نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق

کے قائل ہیں لیکن جو روح ان کے پورے نظامِ تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اسی انکار خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق کی روح ہے اس کی بنیاد پر جو ذہنیت مرتب ہوتی ہے اور جن افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے خواہ وہ کتابوں کی صورت میں مدون ہو یا صرف ذہن ہی میں محفوظ ہو ان سب میں الحاد و مادیت کی روح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے، انفرادی و اجتماعی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں مادہ پرست قانون ساز انسان کے قوانین کا نشوونما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے اور پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر ابھر کر وہ لوگ آتے ہیں جو سب سے زیادہ ڈپلومیٹ اور خبیث النفس ہوتے ہیں، تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مملکت کی زمامِ کار انھیں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ان کی کتابِ آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم ان کے خاص وطن میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں۔ اور اپنے ملک کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری و اقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا نظریۂ حیات جس کو انسان نے اپنا رکھا ہے یہ ہے کہ کائناتِ عالم کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے مگر اس کا ایک خداوند نہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں بلکہ محض خیال آرائی پر اس کی بنا ہے اس لئے موہوم، محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی و الٰہیت کو منسوب کرنے والوں کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے نہ کبھی ہوا ہے خداؤں کی فہرست گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، سیارے زندہ و مردہ انسان۔ درخت، پہاڑ۔ جانور۔ دریا زمین، آگ بادل وغیرہ اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان، ماہی انسان۔ چہار سرا، خرطوم بنی وغیرہ معبودی جگہ پاتے رہے ہیں پھر ان کے گرد اوہام و خرافات کا ایک عجیب طلسم ہوشربا تیار ہوا ہے۔ جس میں واہمہ نے اپنی شادابی و نادرہ کاری کے وہ دلچسپ نمونے فراہم کئے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے جہاں کہیں خداوند اعلیٰ کا تصور کچھ نمایاں ہے وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے چھوٹے خدا اس کے وزیر، مصاحب اور درباری ہیں جن کو

خوش کئے بغیر انسان بادشاہ سلامت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے اس کے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں لیکن جہاں کہیں خداوند اعلیٰ کا تصور بہت دھندلایا قریباً مفقود ہے۔ وہاں تو ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہوکر رہ گئی ہے۔ اسی قسم کے نظریۂ زندگی کو ہم مشرکانہ نظریۂ حیات کہہ سکتے ہیں۔ یہ اپنی بہن نمبر ایک سے ہمیشہ تعاون کرتی رہی ہے مثلاً

(ا) مشرکانہ جاہلیت میں مبتلا انسان اپنے خیالی معبود کو نافع وضار سمجھ کر مراسم عبودیت تو ضرور ادا کرتا ہے لیکن چونکہ اس کو اپنے معبود کی طرف سے کوئی اخلاقی ہدایت یا زندگی بسر کرنے کا قانون وضابطہ نہیں ملتا ایسی صورت میں مشرک انسان خود ہی اپنی فہم وعقل کے مطابق اپنے لئے ایک شریعت تصنیف کرتا ہے اس طرح وہی ملحدانہ جاہلیت برسر کار آجاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک جگہ خداؤں کے لئے عبادت اور عبادت گاہوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے دوسری جگہ نہیں ورنہ اخلاق واعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ بت پرست یونان وروم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

(ب) اسی طرح مشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہوتی ہے جن کو ملحد سوسائٹی اختیار کرتی ہے اگرچہ سوسائٹی کی تعمیر وترتیب میں شرک والحاد دونوں کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص اختیارات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جو شاہی خاندان سے مل کر ایک ملی بھگت قایم کرتا ہے اس طرح عوام پر مذہب کا جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قایم کرتا ہے۔ اس کے بخلاف الحاد پرست سوسائٹی میں یہ خرابیاں نسل پرستی، قوم پرستی، ڈکٹیٹر شپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے انسان کو انسان سے پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کرکے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لئے صیاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

(۳) تیسرا نظریۂ حیات جس کے فریب میں انسان اب تک مبتلا ہے یہ ہے کہ یہ دنیا اور یہ جسمانی

وجود انسان کے لئے ایک دارالعذاب ہے انسان کی روح اس کے جسم کے اندر ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اصل میں اس قید خانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ خواہشات ولذات کو مٹایا جائے اور اپنے اس دشمن نفس و جسم کو مجاہدات وریاضیات کے ذریعہ اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلط قائم نہ ہو سکے اس طرح روح پاک وصاف ہو جائے گی۔

اس نظریہ کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظام فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں۔ ویدانتزم، اشراقیت، یوگ، مسیحی رہبانیت اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظام اخلاق وجود میں آتا ہے جو افیون دکوکین کا کام کرتا ہے خواہ وہ اعمال و عقائد میں ہو یا ادب و سیاست میں۔

یہ نظریہ حیات جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے جاتا ہے اس لئے سوسائٹی کے بدترین شریر افراد کے لئے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس جاہلیت کے اثرات عوام میں غلط قسم کا صبر و تحمل پیدا کرتے ہیں جو انھیں ظالموں کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیتا ہے اسی وجہ سے سماج کے با اقتدار طبقے بادشاہ، امراء اور مذہبی ٹھیکیدار اس راہبانہ فلسفہ واخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے ملے اور یہ ان کی سرپرستی میں پھلتا پھولتا رہتا ہے

اس جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ جیسا بھی ہے وہ ظاہر ہے مگر انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے ساتھ تو نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ دنیا کو یہ دارالعمل اور مزرعۃ الآخرت کے بجائے دارالعذاب اور مایا کے جال کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اس سے جو ذہنیت مرتب ہوتی ہے اس کی رو سے عبادات و اوامر و نواہی کا یہ مفہوم کہ یہ حیات ... ح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لئے تیار کرنے والی چیزیں ہیں یہ ہو جاتا ہے کہ یہ ... گناہ زندگی کا کفارہ ہیں۔ اس طرح انسان روایات کی دنیا میں گم ہو کر خلافت الٰہی کی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے۔ جس کی طرف علامہ اقبال نے بار بار توجہ دلائی ہے جیسا کہ آگے مذکور ہے۔

(۴) زندگی گذارنے کا چوتھا نظریہ یہ ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود جو ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جز ہم خود ہیں دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے اور وہی بلا اشتراک غیرے اس کا مالک ہے۔ انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا اور کچھ ہونا نہ ہونا اس کے امکان میں نہیں جس طرح مملکت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ اور جو ہدایت بھی بذریعہ وحی اس تک پہنچے اس پر وفاداری کے ساتھ عمل پیرا ہو۔ اس کے دنیوی اعمال کا اصل حساب و کتاب مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور اسی کا نام آخرت ہے۔ آخرت کی فلاح و خسران کا مدار اس پر ہے کہ انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کے طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں اور اس کے امر شرعی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ ہے وہ نظریہ جسے ابتدا سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے اس فلسفہ کی بنیاد پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد و قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے تابع شریعت ہونے کی روح ہے بخلاف اس کے دیگر تہذیبوں کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے۔ اس لئے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قایم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اس کے خط و خال رنگ و روغن دوسری تہذیبوں کے بنائے ہوئے نمونہ سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تمدن کی تمام تفصیلات کا نقشہ دوسرے تمام نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، خوراک، لباس، طرزِ زندگی، شخصی کردار، کسبِ معاش، صرفِ دولت، ازدواجی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات دولت کی تقسیم، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، صنعت و تجارت، صلح و جنگ کے معاملات اور خارجی سیاست غرضیکہ انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے معاملات تک اس

تمدن کا طور طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے جس کا ہر جز اللہ کی حاکمیت، انسان کی مسئولیت اور آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے وسیع مطالعہ اور صحیح ذوق و وجدان کی بنا پر اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں۔ اپنے مقالہ "فلسفۂ عجم" کے سلسلہ میں اقبال نے مغربی و مشرقی فلسفے کا نہایت گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا۔ مغربی مفکرین میں فلاطون۔ اگسٹائن۔ سینٹ فرانسیس۔ اگناٹس لا ئیلا۔ میدام دی گایان براڈلے۔ الگزنڈر ہیگل، نطشے۔ برگسان اور مشرقی صوفیا و حکماء میں امام غزالی، رومی۔ جامی۔ حافظ، شیخ سرہندی شنکر آچاریہ۔ رکب ناتھ اور دگمبر وغیرہ کے خیالات کا اچھی طرح سے جائزہ لیا تھا۔ اس وسیع مطالعہ نے اقبال پر ایک بات بہت واضح کر دی اور وہ یہ "کہ قرآن ہدایتِ انسانی کے لئے آخری صحیفہ ہے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر انسان اس کا مطالعہ خشوع و خضوع سے کرے تو اس پر کائنات کے تمام اسرار سربستہ کھل جائیں۔ رسول صلعم کی زندگی اس قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ ختم نبوت کے لئے وہ ایک انوکھی دلیل سے کام لیتے تھے ان کا کہنا ہے کہ محمد رسول اللہ پر نبوت اس لئے ختم ہوگئی کہ انھوں نے انسانیت کو ایک ایسا نظام زندگی دیا جو عقل پر مبنی ہے۔ معجزات کی ضرورت اب اس لئے باقی نہیں کہ انسانی عقل اب اپنی فلاح و بہبود کے وسائل خود متعین کر سکتی ہے۔ قرآن کی تعلیمات اور عقلِ انسانی میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ انسانی نشو ونما کے لئے جن بنیادی قوانین اور اصولوں کی ضرورت ہے وہ دے دیتے گئے ہیں۔ ان اصولوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی البتہ ان کی روشنی میں ضرورتِ زمانہ کے مطابق اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اقبال کی نظر میں عہدِ حاضر کا انسان جو قلب و نظر کے امراض فاسدہ میں مبتلا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کے پیش کردہ دینِ فطرت یعنی اسلام کے اصولوں کو پس پشت رکھا ہے اور نتیجہ کے طور پر تشکک ولادینیت، جبریت و ذواتیت، کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ آیئے کے لئے اقبال کے ساتھ ان روحانی امراض پر ایک نظر ڈالیں۔

(۱) تشکیک ولادینی :- تہذیبِ حاضر کے زیر اثر جو نسل پیدا ہوتی ہے اس کی نظر میں مذہب

ایک "جنونِ خام" ہے اور "ہستی غایب" کی تلاش کرنے والے احمق و نادان ہیں۔ علومِ جدیدہ کی بنا محسوس پر ہے۔ اس لئے موجود وہی ہے جو محسوس ہے۔ حقیقت کا علم ہمیں ادراک، مشاہدہ اور استقام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور ہمارے تمام تصورات ان ہی ارتسامات کی نقول ہیں گویا ارتسام تصور کی اصل ہے۔ بالفاظِ دیگر ہمارے لئے حقیقی چیز وہی ہوگی جس کو ہم محسوس کریں مذہب کا معروض "ہستی غایب" ہے جس کا کوئی ادراک یا احساس ممکن نہیں لہٰذا اس کا کوئی علم قابلِ حصول نہیں اس کی تلاش ایک سیاہ بلی کی تلاش ہے جو ایک تاریک کمرہ میں کی جارہی ہے جو اس کمرہ میں موجود نہیں ہے" یہ ہے استدلال دورِ حاضر کے نوجوان انسانوں کا جو اپنا مسلک مذہب کے خلاف انتہائی تجربیت یا احساسیت کو قرار دیتے ہیں۔ اقبال نے اس کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ — ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غایب کی ہے تلاش
محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی — اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام — ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور — مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است — ہر چند عقلِ کل شدہ بے جنوں مباش

"بے جنوں مباش" ہی میں حقیقتاً انسانیت کی فلاح و بہبود ہے لیکن بقول حسرت مرحوم ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

آج مذہب سے بے زاری کا نتیجہ یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے نوجوان کے لئے نہ زندگی کی کوئی غایت ہے اور نہ تخلیقِ کائنات کی کوئی غرض یا مقصد بلکہ وہ اس سوال ہی کو لایعنی سمجھتے ہیں کہ کیا زندگی کی کوئی غایت ہوسکتی ہے اور عالم کا کوئی مقصد؟

مسلمانوں کی نئی پود میں لادینی اور الحاد کے اسی میلان کو علامہ اقبال نے "فردوس بریں" کی مشہور نظم میں مکالمہ کی صورت میں اس طرح پیش فرمایا ہے ؎

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز — حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدیٔ شیراز

کچھ کیفیتِ مسلمِ ہندی تو بیاں کر — واماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ و تاز
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں — تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمئ آواز
باتوں سے ہوا شیخ کے حالی متاثر — رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحبِ اعجاز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی — فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو — پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

الحاد کے انداز پیدا ہوتے ہی کردار میں تغیر کا رونما ہونا ضروری تھا۔ اوامر و نواہی کی پابندی اور رضائے الٰہی کا خیال، سزا کا خوف اور جزا کی امید، یہ سب محرکات ہمارے عصرِ حاضر کے نوجوان کے نزدیک نہ قابلِ التفات ہیں اور نہ لائقِ توجہ۔

جدید نفسیات یا تحلیلی نفسیات Psycho-Analysis نے نوجوانوں کو تعلیم دی ہے کہ ذہنِ انسانی کا بیشتر حصہ غیر شعوری ہے انسانی شخصیت کی مثال برف کے اس انبار کی سی ہے جو سمندر میں بہتا رہتا ہے اس کا صرف تھوڑا سا حصہ سطحِ شعور کے اوپر نظر آتا ہے باقی سب نیچے پوشیدہ ہوتا ہے یہ حصہ جس کو غیر شعوری نفس کہا جاتا ہے نہ صرف نسبتاً بہت زیادہ بڑا بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی نفس شعوری سے کہیں زیادہ عظیم الشان ہوتا ہے۔ شعور میں جو کچھ نمایاں ہوتا ہے وہ غیر شعوری نفس ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ لہذا انسان کے ذہن کا شعوری حصہ اہمیت کی چیز نہیں اس لئے کہ اس کا سارا مواد اور اس کے سارے اعمال و وظائف ان قوتوں کے اظہار ہیں جن کا نہ ہمیں عام طور پر علم ہوتا ہے اور نہ یہ ہمارے تصرف و اختیار میں ہوتے ہیں۔ اس طرح جب کسی غیر شعوری خواہش کا ظہور شعور میں ہوتا ہے تو وہ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی لہذا ہم اپنی سیرت کے آپ معمار نہیں ہماری سیرت نتیجہ ہے اُن تاثرات، تحریصات، ترغیبات اور قوتوں کے باہمی عمل یا تعامل کا جو غیر شعوری نفس میں جاری ہیں اور جن کا ہمیں علم نہیں۔ اگر ہم سے یہ کہا جاتے کہ ہمیں ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیے۔ بری خواہشات کو دبانا چاہیے کرنا چاہیے تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

اگر ہم ان کے ضبط پر قادر بھی ہوں تو جدید نفسیات کی تعلیم ہے کہ ان کی نفی یا ان کا دبا دینا ہماری ذہنی صحت

کے لئے سخت مضر ہوتا ہے۔ اسکردواآملڈ کا کہنا ہے کہ کسی خواہشِ نفسی سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کی تکمیل کرلی جائے۔

ہماری توانائی و قوت کے مبدا اصلی کو جو ڈی بی ڈو (libido) کہلاتا ہے فرائیڈ اس کو چشمۂ آب سے تشبیہ دیتا ہے جو زمین کے نیچے بہہ رہا ہے اور کسی مخرج کی تلاش میں ہے اگر تم اس چشمہ کو نشیب لگا کر روک دو اور اس کے پانی کو بہہ کر نکلنے کا موقع نہ دو تو پھر یہ بند ہو کر کیچڑ پیدا کرتا ہے یہ کیچڑ گویا مؤلفات (complexes) ہیں اور بخارات عہد حاضر کی زندگی کے وہ بے شمار عصبی امراض Neurosis اور سقیم خوف Phobias جن کا نفسی تحلیلی علاج کرنا چاہتی ہے اور علاج کا طریقہ بس یہی ہے کہ ان رکی دبی خواہشات کو ظاہر ہونے دیا جائے۔

لیکن اس کے برخلاف دین و مذہب کی روح تو یہ ہے کہ اوامرِ الٰہی کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کی کوشش کی جائے۔ اور جدید نفسیات کی تعلیم یہ کہ خواہشات کو بے لگام رکھنا ہی صحتِ ذات کے لئے ضروری ہے اسی ہوس رانی کا اصطلاحی نام اظہارِ ذات Self-expression ہے جس کو D. H. Lawrence وغیرہ کے ناولوں نے عام فہم بنادیا ہے۔

بہرحال ان تعلیمات و خیالات نے مذہب و اخلاق کی بیخ کنی کردی۔ نوجوانوں کے قلوب مسخ ہوگئے، دل تیرہ اور نگاہ بے باک ہوگئی۔ ان کی عقل اور ان کا دل طوافِ آب و گِل میں گرفتار ہوگیا۔ "جاوید نامہ" میں اسی حالت کا نقشہ ان دردناک الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

گر خدا سازد ترا صاحب نظر		روزگارے را کہ می آید نگر
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز		چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن دین و سیاست عقل و دل		زوج زوج اندر طوافِ آب و گِل

آگے چل کر کچھ اور وضاحت کی گئی ہے ؎

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ		شستہ رُو تاریک جاں روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید		چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

نوجوانوں نے دین فطرت کو ہاتھ سے کھو کر اور عقل و استدلال کو اختیار کر کے کیا پایا؟ مادی عقل نے ان کے قلوب میں کیا انقلاب پیدا کر دیا؟ ان کے نقطۂ نظر کے بدل جانے سے جہان اور جہان کے چارسوؤں کے تیے کیسے بدل گئے۔ اقبال کو جو نظر آیا وہ یہ تھا۔ ؎

جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب — دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک

یعنی روح اخلاقی اقدار سے محروم ہو کر لاغر ہونے لگی اس کے عوض تن میں فربہی پیدا ہونے لگی لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق، ایمان کا گداز، روح کی پاکیزگی اور عفت ان سے رخصت ہو گئی۔

۲۔ جبریت:۔ جدید تحلیلی نفسیات کے تعلیم کے بارے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے تمام شعوری ارادات و واقعات کا مبدا اصلی غیر شعوری نفس ہے گویا ہماری شعوری خواہشات اور افکار عکس ہیں ہمارے غیر شعوری عناصر کا جو غایب و غیر معلوم ہیں اور ہمارے اختیار سے باہر اس لئے ہم اپنے شعوری افکار و خواہشات کے ذمہ دار نہیں۔ لہذا پرستان مذہب و اخلاق کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہمارا ارادہ آزاد ہے اور وہ ہمارے افکار و خواہشات پر حکمرانی کرتا ہے انھیں اپنے اقتدار میں رکھتا ہے جو خواہشات کہ ہماری روح کے مفاد کے خلاف ہوتی ہیں انھیں ترک کر دیتا ہے اور جو اس کی فلاح کی معاون ہوتی ہیں انھیں کو اختیار کرتا ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ صرف جبلتیں ہی انسانی اعمال کی حقیقی محرکات ہیں اور انھیں جبلتوں کی تشفی کے لئے ہم عمل کرتے ہیں جن پر ہمیں کوئی اقتدار حاصل نہیں، اس لئے ع "اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا" ہمیں اپنے حال پر رہنے دے یہ ہے عقیدۂ جبریت آج انسان کے اندر جبریت کا اثر "عقیدۂ تقدیر" کی غلط فہمی کی وجہ سے زہر کی طرح سرایت کر گیا ہے اور ان کے عمل کی قوت کو مفلوج کر دیا ہے۔ نہ صوفی میں مجاہدانہ حرارت رہی اور نہ سالک میں مستیٔ کردار۔ شاعر کی نوا افسردہ و بے ذوق ہو کر رہ گئی۔ مرد مجاہد مفقود ہو گیا ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

تقدیر کے غلط عقیدے نے خاص کر مسلمانوں کو عمل سے غافل کر دیا۔ قسمت ہی میں ایسا لکھا تھا

کہ گروہ زندگی کی کشمکش سے کنارہ کش ہوگیا اور اپنی شکست تسلیم کرلی ؎

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

لذت اندوزی اگر ہم عمل و مجاہدے سے اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتے اگر ہم اپنے مستقبل کے سنوارنے میں اتنے ہی مجبور ہیں جتنے کہ اپنے ماضی کے بدلنے میں تو پھر ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے وہ جیسی بھی کچھ ہے پوری طرح بہرہ اندوز ہونا چاہئے اور جو کچھ مل جائے اس سے لطف اندوز ہونا چاہئے اسی کو کہتے ہیں "اگر زمانہ نسازد تو با زمانہ بساز" یہیں سے لذت اندوزی کی بنا پڑتی ہے۔

عصرِ حاضر نے اس کو یہ تعلیم دی کہ مذہب کا یہ فرمان کہ انسان کو ہوائے نفسانی کی مخالفت کرنی چاہئے اور خواہشاتِ طبعی کو شرع کے تحت میں رکھنا چاہئے نہ صرف ناقابلِ عمل ہے بلکہ شخصیتِ انسانی کے لئے قطعاً مضر بھی ہے۔ فرائڈ نے ذرا تفصیل سے بتایا کہ موجودہ زمانہ کی بے شمار ذہنی بیماریاں۔ عصبی امراض، ہسٹریا اور زندگی سے بیزاری اور عدمِ طمانیت نتیجہ ہیں جوانی میں فطری خواہشات کو دبانے اور روکنے کا صحت و طمانیت کے لئے انکارِ ذات نہیں بلکہ اظہارِ ذات کی ضرورت ہے، نقد وقت کو ہاتھ سے کھونا شخصیت کی عمارت کو جڑ سے اکھاڑنا ہے اس لئے عصرِ حاضر کا انسان اس عقیدہ کا پورا قائل نظر آتا ہے کہ اوقاتِ فرصت کو لذت اندوزی میں صرف کرنا چاہئے وہ ان افعال و اعمال کو لذت بخش تصور کرتا ہے جو ہوائے نفسانی کی تکمیل کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ جنسی خواہشات، رقص و سرود، اور لہب و لعو کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ خوشی و راحت محض نفس کی خاطر ہے، زندگی کے فرائض کو انجام دینے کی خاطر نہیں۔ مختصر یہ کہ عصرِ حاضر کا نوجوان اقبال کے الفاظ میں بدن ہی میں غرق ہے اور جان سے بے خبر ہے ؎

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں در بدن غرق است و کم داند ز جاں

اقبال اس قوم کو اور اس قوم کے افراد کو جنہیں "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" یعنی تم بہترین گروہ ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان و یقین رکھتے ہو کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا انھیں عصری آلودگیوں میں پھنسا ہوا دیکھتے ہیں تو خون کے آنسو بہاتے ہیں اور درد و اضطراب کی حالت میں ان کے مہلک امراض یعنی ان کے ظلمت آباد چراغ

ضمیر کو، ان کی غلامی اور حریت دشمنی کو، ان کی لادینی و الحاد کو ان کی فرنگ مستی اور اپنی عینیت و حقیقت سے بیگانگی کو ان کی بزدلی اور موت سے خوف زدہ ہونے کو ان کی لذت پرستی اور عیش کوشی کو، یورپ کے باطل عقائد کو اپنے قلب کی پہنائیوں میں جگہ دے کر اور پھر ان کے آگے سجدہ ریز ہونے کو کس درد کے ساتھ سرورِ دوعالمؐ کے حضور میں پیش کرتے ہیں اور دعا طلب کرتے ہیں ؎

این مسلماں زادۂ روشن دماغ ظلمت آباد، ضمیرش بے چراغ
مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
مومن از رمزِ مرگ آگاہ نیست در دلش لا غالب الا اللہ نیست
از فرنگی می خرد لات و منات مومن و اندیشۂ او سومنات
قم باذنی گوئے او را زندہ کن در دلش اللہ ہو را زندہ کن

شہزادہ تو کو خطاب کر کے "جاوید نامہ" میں اقبالؔ نے جو نصیحت کی ہے اس کا حاصل بس اتنا ہے کہ سادہ دلوں کے یقین کو فلسفیوں کے نکتہ ہائے دقیق پر ترجیح دے کر بے دلیل و برہان از روئے جان یعنی قلب کی گہرائیوں سے اپنے خالق کی الوہیت اور محمدؐ عربی کی رسالت کا اقرار کر لے۔

اقبالؔ کے نزدیک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان کامل نہ ہونے کی وجہ سے آج دنیا مختلف قسم کے ذہنی و دماغی اور معاشی و عمرانی امراض میں مبتلا ہے۔ دنیا کی اکثر و بیشتر قومیں تو صرف ابھی لا کی منزل سے گذر رہی ہیں الا اللہ سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اقبالؔ کو تہذیب حاضر سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مجلس میں صرف شراب لا کا دور چل رہا ہے الا اللہ کی بوتل کا کہیں پتہ نہیں ؎

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

لا بیشک نقشِ باطل کو مٹاتا ہے لیکن اس کے بعد نقش حق کو بھی تو ثبت کرنا چاہئے ورنہ مقصد حیات جاتا رہے گا ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے الا می خرامد کائنات

جو قومیں صرف لا کا وظیفہ پڑھتی ہیں وہ اپنی طاقت انسانوں کو تباہ کرنے میں صرف کرنے لگتی ہیں

اور جب حد سے گذر جاتی ہیں تو خود تباہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

اس لئے نفی کے بعد اثبات کرنے سے ہی زندگی کے مختلف شعبوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اعتدال بنی آدم کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے چار صفحات کے اندر علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں "لا الہ الا اللہ" کی تفسیر پیش کی ہے جس کی تفصیلات خالی از طوالت نہیں لیکن اجمالاً دو ایک باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال امتاں را لا جلال الا جمال

یعنی توحید کی اصلیت و حقیقت سمجھنے کے لئے قال کی ادنیٰ منزل سے گذر کر حال کی منزلِ رفیع میں داخل ہونے کی ضرورت ہے جو لوگ اس تہ سے آشنا ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎ امتاں را لا جلال الا جمال جلال سے مراد ہے قاہری اور جمال سے مراد ہے دلبری۔ قاہری دل میں خوف پیدا کرتی ہے اور دلبری دل میں محبت پیدا کرتی ہے اور یہ دونوں حیاتِ انفرادی اور حیاتِ اجتماعی کے لئے ضروری ہیں یعنی زندگی کی دو شانیں ہیں جن کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی قاہری و دلبری دونوں ایک ذات میں جمع ہو جائیں تو انسان میں پیغمبری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن صرف دلبری جادوگری ہے اور صرف قاہری ابلیسیت ہے ؎

دلبری با قاہری پیغمبری است دلبری بے قاہری جادوگری است

اسی طرح جب کوئی قوم لا الہ کا نعرہ بلند کرتی ہے خواہ وہ جرمنی ہو یا رومی، انگلستی ہو یا امریکن روسی ہو یا کوئی اور تو وہ اپنے اقوال و افعال سے "دیگرے نیست" کا اثبات کرتی ہے اس سے فرد و قوم دونوں کے اندر بے پناہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اسی طاقت کا دوسرا نام جلال ہے لیکن جب کوئی قوم قاہری یا جلال کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ لا الہ کے بعد الا اللہ بھی ہے تو وہ تقویٰ و طہارت، شرافت و انسانیت رحمدلی و فیاضی وغیرہ صفاتِ حسنہ کی حامل بن جاتی ہے۔ اس کے اندر

روحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ حسین و جمیل بن جاتی ہے اور دنیا اس کے سایہ کے اندر آنا چاہتی ہے۔ انفرادی طور پر جلال کو معہ جمال دیکھنا ہو تو عمر فاروق اور حیدر کرار کی سیرت پر نظر ڈالئے اور جلال کو بغیر جمال کے دیکھنا ہو تو اس کی کیفیت مہدی سوڈانی کی استخوانِ سوختہ سے پوچھئے یا چنگیز و ہٹلر میں دیکھئے۔ حیدر کرار کی خودی کو جس کے اقبال مؤید ہیں حضور اکرم صلعم کے حسین و جمیل ہاتھوں نے بنایا اور سنوارا ہے ہٹلر کی خودی کو نطشے نے ترتیب دیا ہے وہ نطشے جس کے متعلق اقبال کہتے ہیں ؎

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم نگاہ چاہیئے اسرارِ لا الٰہ کے لئے
خدنگِ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لئے

نطشے کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہی ان تمام مشرقی و مغربی مفکرین و مصلحین پر منطبق کیا جاسکتا ہے جو کلمۂ توحید کے اسرار سے بے بہرہ ہیں۔ نطشے کا "فوق البشر" عقلیت کا پوجاری۔ عشق سے عاری اور ایمان و یقین سے خالی ہے اس کے نزدیک رزم گاہِ حیات میں نیکی نہیں بلکہ قوت درکار ہے تاکہ کمزوروں پر غلبہ حاصل کیا جا سکے، وہ اخلاقی خوبیوں کو کمزوری پر محمول کرتا ہے اور خیر و شر کو محض اضافی حیثیت دیتا ہے۔ وہ دراصل "بقائے اصلح" کے بجائے "بقائے اقویٰ" کا قائل ہے اس کے برخلاف اقبال کے "انسان کامل" کا خمیر دین فطرت کی مٹی سے بنا ہے جس میں بہت سے اجزار شامل ہیں۔ اس کا انسان کامل خودی کا پیکر ہے۔ عشق کا حامل ہے وہ عشق جہاں عقل کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور ذوق و وجدان کی کارفرمائی شروع ہوتی ہے۔ وہ حیات و حرکت کا مجسمہ ہے۔ اور شریعت نبوی کا پابند۔ اس کا ایمان تابندہ، اس کی آرزو زندہ اور اس کا عزم و استقلال پائیدار۔ وہ دنیا کا بادشاہ ہے لیکن ایک مردِ قلندر ہے جو روحانی قدروں کے سامنے دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ "بقائے اقویٰ" کے بجائے "بقائے اصلح" ہے۔ وہ قومی حاکم نہیں بلکہ انسانیت کا علمبردار ہے۔

بہرحال اقبال تو عصرِ حاضر کے انسان کو "مردِ قلندر" دیکھنا چاہتے ہیں جس کی پہچان اپنے بلیغ و شاعرانہ انداز میں ضرب کلیم کے صفحات میں اس طرح پیش کی ہے ؎

کہتا ہے زمانہ سے یہ درویش جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی اُدھر جا

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اُتر جا

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

اب یہ فیصلہ کرنا عہدِ حاضر کے انسان کا کام ہے کہ وہ "مردِ قلندر" بننا چاہتا ہے یا "فوق البشر انسان" وما علینا الا البلاغ

اخلاق و فلسفۂ اخلاق

مکمل اور جدید ایڈیشن

علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کو سامنے رکھ کر اصولِ اخلاق، فلسفۂ اخلاق اور انواعِ اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے ایک مخصوص اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے اسی کے ساتھ اسلام کے نظامِ اخلاق کی تفصیلات کو ایسی دل پذیر ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس کے مجموعۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے اخلاقی نظاموں کے مقابلے میں روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

فی الحقیقت ہماری زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی۔ جس میں ایک طرف علمی اعتبار سے اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ہو اور دوسری طرف ابوابِ اخلاق کی تشریح علمی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہو کہ اس سے اسلام کے مجموعۂ اخلاق کی برتری دوسری ملتوں کے ضابطہائے اخلاق پر ثابت ہو جائے۔ اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے اور اس موضوع پر ایک معیاری کتاب سامنے آ گئی ہے۔ اس ایڈیشن میں بہت کچھ حک و فک کیا گیا ہے اور متعدد مباحث کو نئے سرے سے مرتب کیا گیا ہے، حجم بھی پہلے سے کافی بڑھ گیا ہے صفحات ۵۹۲ بڑی تقطیع قیمت غیر مجلد چھ روپے آٹھ آنے ؎ مجلد سات روپے آٹھ آنے ؎